اگست
2000

قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لکھتے ہیں (القرآن)

روزنامہ اوصاف اسلام آباد

ہمارے ذہن پر چھائے نہیں ہیں حرص کے سائے
جو ہم محسوس کرتے ہیں وہی تحریر کرتے ہیں

جمعرات 10 اگست 2000ء 9 جمادی الاول 1421ھ

علم کلام کی موشگافیاں اور یقین و ایمان کی منزل

راجہ انور صاحب محترم نے اپنے تازہ مضامین میں بنیادی طور پر دو باتوں کی شکایت کی ہے ایک یہ کہ میں ان کے ساتھ بحث و گفتگو میں علم کلام کی موشگافیوں کا سہارا لے رہا ہوں اور دوسری یہ کہ جہاد افغانستان کے حوالہ سے ان کے سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکا اس لئے باوجود اس کے کہ مجھے بعض ذمہ دار دوستوں کی طرف سے اس مباحثہ کو سمیٹنے کے اشارات مل رہے ہیں راجہ صاحب کی ان دو شکایتوں کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

جہاں تک علم کلام کا تعلق ہے اس کا قصہ صرف اتنا ہے کہ راجہ صاحب موصوف نے اپنے ایک مضمون میں مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کے ساتھ اس تحریری گفتگو میں علم کلام کی موشگافیوں میں نہ پڑوں جس کے جواب میں 'میں نے عرض کیا تھا کہ اگر کسی مسئلہ کا تعلق علم کلام سے ہو گا تو اس کے بارے میں رہنمائی بھی "علم کلام" ہی سے حاصل کرنا ضروری ہو گی۔ اس جواب سے راجہ انور نے تصور کر لیا کہ میں اپنے استدلال کی بنیاد علم کلام کی موشگافیوں پر رکھ رہا ہوں حالانکہ میرے مضامین کا باقاعدگی کے ساتھ مطالعہ کرنے والے قارئین اچھی طرح جانتے ہیں کہ کسی بھی مسئلہ پر میرا استدلال 'روایات و واقعات' مشاہدات اور پس منظر و نتائج کے تجزیہ کے حوالہ سے ہوتا ہے اور فلسفیانہ طرز گفتگو سے حتی الوسع گریز کرتا ہوں۔

راجہ صاحب کو معلوم ہو گا کہ فلسفہ 'منطق اور کلام کے علوم کو ہمارے ہاں درس نظامی میں معقولات کی اصطلاح کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔ میری بدقسمتی ہے کہ میں طالب علمی کے دور میں معقولات کا کوئی لائق طالب علم شمار نہیں ہوتا تھا اور اپنی اس نالائقی میں ابھی تک کوئی کمی نہیں کر سکا۔ میں "روایت" کی دنیا کا طالب علم ہوں 'حدیث نبوی' اور تاریخ میرے مطالعہ کے خصوصی مضامین ہیں اسی لئے کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے قرآن و سنت 'سیرت نبوی' اور اسوہ صحابہ کرامؓ کے بعد سب سے زیادہ تاریخی واقعات اور ان کے بعد ذاتی مشاہدات اور متعلقہ معاملہ کے پس منظر اور نتائج کے معروضی تجزیہ پر زور دیتا ہوں اور اسی دائرہ میں موقف کے تعین اور اس کی وضاحت کو ترجیح دیتا ہوں اگر کوئی دوست میرے مضامین پر ایک نظر پھر سے ڈالنے کی زحمت گوارا کریں گے تو ان کے لئے میری اس گزارش کو سمجھنا

زیادہ آسان ہو جائے گا مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدانخواستہ "عقل و درایت" کا مخالف ہوں اور اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتا بلکہ "عقل و درایت" کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھتا ہوں۔ اپنی وسعت و استطاعت کے دائرہ میں اس سے بھرپور استفادہ کی کوشش کرتا ہوں اور بحث و استدلال میں اس کے جائز مقام کو تسلیم کرتا ہوں مگر جہاں روایت و درایت میں ایسا تعارض آ جائے جسے رفع کرنا ممکن نہ ہو تو روایت کو ترجیح دیتا ہوں اور شعوری طور پر اس کا یہ حق سمجھتا ہوں کہ اسے ترجیح دی جائے اور اس سلسلہ میں میرے لئے اسوہ حضرت ابوبکرؓ کا ارشاد گرامی ہے کہ جب ان سے کفار مکہ نے جناب نبی اکرم ﷺ کے سفر معراج کے بارے میں یہ سوال کیا تھا کہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ رات کے تھوڑے سے حصے میں بیداری کی حالت میں مکہ مکرمہ سے بیت المقدس جا کر واپس آ گیا ہے تو کیا تمہاری عقل اس بات کو تسلیم کرے گی؟ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے یہ تاریخی جواب دیا تھا کہ اگر یہ بات حضرت محمد ﷺ نے کہی ہے تو میں یہ دیکھے بغیر کہ عقل اس کو تسلیم کرتی ہے یا نہیں اس پر ایمان لاتا ہوں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ میرے نزدیک روایت و درایت کے درمیان یہی "حد فاصل" ہے جو ہمارے ایمان و عقیدہ کی بنیاد ہے اور اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ عقائد و ایمانیات کی بنیاد عقل پر نہیں بلکہ وحی پر ہوتی ہے البتہ ان کی تعبیر و تشریح اور افکار و نظریات کا میدان عقل کے لئے کھلا ہے اور یہی عقل و درایت کی اصل جولانگاہ ہے اپنی اس گزارش کی مزید وضاحت کے لئے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ عقل و درایت کے باب میں انسانی برادری کے افراد و طبقات کا معیار اور ذہنی سطح کبھی ایک نہیں رہی اور نہ کبھی ہو سکتی ہے اس لئے کسی مسئلہ پر بھی انسانوں کا کسی ایک رائے پر متفق ہونا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ عقل و درایت کے دائرہ میں بھی مسلسل وسعت پیدا ہو رہی ہے اور ہوتی چلی جائے گی چنانچہ آج سے ایک صدی پہلے کی ذہنی سطح اور عقلی دائرہ آج سے مختلف تھا اور آج سے ایک سو سال بعد کا عقلی دائرہ بھی یقیناً آج سے قطعی مختلف ہو گا اسے کسی جگہ ٹھہراؤ نہیں ہے اسی لئے "عقل و درایت" کی بنیاد پر کسی مسئلہ میں ایسی حتمی بات کہنا ممکن ہی نہیں ہے جس میں کسی تغیر اور تبدیلی کی گنجائش نہ رہے جبکہ عقیدہ اس "ایمان و یقین" کو کہا جاتا ہے جس میں کوئی لچک نہ ہو اور نہ ہی اس میں کسی ردوبدل کی گنجائش ہو اور یہ صرف وحی سے حاصل ہوتا ہے

اس کے علاوہ اس درجہ کے "یقین و ایمان" کے حصول کے لئے انسان کے پاس اور کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ عقل کی آخری منزل اور انتہاء "ظن غالب" ہے اس سے آگے بڑھنا اس کے بس میں نہیں ہے مگر وحی کا آغاز اس سے اگلی منزل یعنی یقین سے ہوتا ہے اس لئے جب بھی وحی اور عقل میں تعارض آئے گا اور ان میں تطبیق کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی تو وحی کو ترجیح دیکر عقل کی کوتاہ دامنی کا اعتراف کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس مسئلہ کا تاریخی تناظر میں بھی مختصر جائزہ لے لیں کہ عقائد و افکار کے بارے میں دو گروہوں نے نسل انسانی کی رہنمائی کی ہے ایک فلاسفہ کا گروہ ہے جس نے عقل و درایت اور غور و تدبر کے ذریعہ کائنات کی حقیقت اور اس کے مقصد تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور لوگوں کو اس راستہ پر چلانے کی کوشش کی ہے جبکہ دوسرا گروہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا ہے جس نے وحی کی بنیاد پر انسانوں کو کائنات کی حقیقت و مقصد سے آگاہ کیا ہے اور انہیں ایمان و یقین کی منزل سے ہمکنار کیا ان دونوں گروہوں کی کاوشوں کا نتائج کے حوالہ سے تجزیہ کر لیں کہ کون سا گروہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے؟ انبیاء کرام علیہم السلام نے نہ صرف نسل انسانی کو وجود باری تعالیٰ 'توحید' قیامت 'رسالت' نجات اور دیگر ایمانیات کے بارے میں متفقہ عقیدہ دیا ہے بلکہ روحانی سکون اور قلبی اطمینان کی منزل سے بھی ہمکنار کیا ہے مگر فلاسفہ تمام تر ریاضتوں' مشقتوں اور طویل غور و تدبر کی کلفتیں برداشت کرنے کے باوجود کسی متفقہ نتیجہ تک پہنچنے میں اب تک ناکام ہیں اور نسل انسانی کے ذہن کو فکری انتشار اور پراگندگی کے سوا کچھ نہیں دے سکے اور غالباً "فلسفہ و عقل کی اسی بے بسی اور بے چارگی کا تذکرہ کرتے ہوئے کسی شاعر نے کہا ہے کہ

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے' اور سرا ملتا نہیں